

جبر کی سائنس سے صبر کی سائنس تک

یادش بخیر، الطاف گوہر صاحب آج کل " نوائے وقت " میں " جنوں کی حکایت " لکھ رہے ہیں۔ اردو دان اور اردو خواں عوام کے لئے، ان ایسے خواص کا اتنا درد، عین الطاف اور عین نوازش ہی تو ہے۔

" ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے "

لطف سخن تو ہے ہی خداداد چیز، لیکن میں نے دیکھا ہے کہ مطلق، مقطوع یا ان کے بیچوں بیچ، سخن گسترانہ باتوں کی " تنصیب " کا جیسا ہنر انہیں آتا ہے، اس میں بھی وہ یکتا ہیں۔ بلکہ یکہ تازہ ہیں۔ اپنے یکم دسمبر (۶۹۳) کے کالم " باتیں نواب کالا باغ مرحوم کی "----- میں الطاف صاحب نے حسب معمول بڑے مزے کی اور بڑی پے کی باتیں کہی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں----- فیض احمد فیض نے کہا " دیکھو نا! جبر کی بھی ایک سائنس ہے۔ جسے ہر وہ شخص جو اقتدار کی کرسی پر قبضہ کر لے نہیں سمجھ سکتا۔ بعض مستند جابر ہوتے ہیں اور بعض نوآسوز، اب نواب کالا باغ تھا، نجیب الطرفین جابر، کیا مجال کسی چھوٹے آدمی پر ہاتھ ڈالے مگر سارے مغربی پاکستان میں اس کی دہشت تھی۔ بھٹو صاحب اس کی نقل کرتے تھے مگر جبر کی سائنس سے نا آشنا تھے۔ "

یوں، الطاف صاحب نے اپنے کالم میں جبر کی سائنس کو حوالہ بنا کر نواب کالا باغ مرحوم کی شخصیت اور کردار کے متعلق گفتگو کی ہے۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ اول تو ہماری سمجھ میں یہ جبر کی سائنس آئی ہی نہیں۔ دیکھیے، ایک ہوتی ہے جبریت، جسے آپ ایسے پڑھے لکھے Fatalism یا Determinism کہیں گے۔ اور ایک ہوتی ہے جبریت، جسے شاید آپ Omnipotence کہیں گے۔ اب اگر ان کی کوئی سائنس، دریافت کر لی جائے تو ٹھیک ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں۔ لیکن یہ جو جبر کی سائنس ہے، یہ تو مستلزم ہوگی ظلم و استبداد اور جو رو جلا کی سائنسز کو۔ اور جو جبر کی سائنس آپ کو پتا ہے، عبارت ہے----- " افضل الجہاد، کلمۃ الحق عند السلطان الجائر " سے! " جائز حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنے سے (جی ہاں! سلطان جابر نہیں، سلطان جائز!) جبکہ جلا کی سائنس-----؟ یہ تو ہمت پرانی ہے۔

جہاں کم کن کہ فردا روز محشر
پہ پیش عاشقان شرمندہ باشی

کسان میں یہ چاہتا ہوں کہ ظلم، ظلم ہوتا ہے، استبداد، استبداد ہوتا ہے۔ اور جبر، جبر ہی ہوتا ہے۔ باقی رہی جبر کی سائنس، تو----- دل کے ہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ ہاں البتہ یہ اپنی اپنی قسمت اور ہمت پہ موقوف

ہے کہ کون نواب کالا باغ اور بھٹو کے دور میں مقتل کو سرخرو کرتا ہے اور کون منصف و جاہ کو!
ایک اور بات جس پر ہم چونکے اور ٹھٹکے، ---- ہے وہ بھی سخن گسترانہ! الطاف، صاحب روای ہیں کہ
نواب کالا باغ نے ان سے کہا۔

”ایک دفعہ عطاء اللہ شاہ بخاری میانوالی تشریف لائے، ان کی جاودہ بیانی کا یہ اثر ہوا کہ صلح بھر کے لوگ رات رات بھر بیٹھے ان کے ارشادات سنتے اور سر دھتے، انہوں نے اعلان کیا کہ وہ نواب کالا باغ کے ظلم اور جبر کے خلاف جہاد کا علم لے کر نکلے ہیں، نواب صاحب کے مخالفین نے شاہ صاحب کو اور چڑھا دیا۔ بے شمار لوگ اس جہاد میں ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ جمعرات کی شام کے جلسے میں انہوں نے اپنے جاں فرودوں کو اطلاع دی ”کل جمعہ کی نماز کے بعد میں سرپرکھن باندھ کر کالا باغ روانہ ہو جاؤں گا، کیا آپ میرے ہمراہ چلیں گے؟“ حاضرین جلسہ نے بیک زبان کہا ”ہاں چلیں گے“ اس اعلان کی گونج نواب کالا باغ کے کان بھی پڑی۔ انہوں نے اپنے ایک معتد کے ہاتھ عطاء اللہ شاہ بخاری کی خدمت میں یہ پیغام بھجوایا کہ حضور شاہ صاحب بڑی خوشی سے کالا باغ تشریف لائے، جو کفن آپ سر پر باندھ کر آئیں گے ہم آپ کو وہی کفن پہنا کر واپس بھیج دیں گے“ نواب صاحب کے قول کے مطابق شاہ صاحب نے یہ پیغام لخصہ کے بعد کالا باغ آنے کا ارادہ ترک کر دیا، تو جبر کی سائنس یہ ہے کہ مد مقابل کو پہنچا تو اور جب اس کے گردبان پر ہاتھ ڈالو تو یہ اطمینان کر لو کہ تمہارے پاؤں زمین پر رہے رہیں، اور وار کو تو ایسا کہ رقیب روسیہ جابر نہ ہو سکے۔ کسی کمزور آدمی پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔“

اب میں کیا عرض کروں، کہ یہاں تو جبر کی سائنس، استوائے لاغری سے دکھائی بھی نہیں دے رہی۔ دعویٰ، دلیل، روایت اور درایت کی رو سے بلکہ روایت سے بھی، اس حکایت کو پایہ ثنابت تک پہنچانا محال ہے۔ پایہ ثنابت کہاں، اسے پایہ ثبوت تک بھی نہیں پہنچایا جاسکتا۔ وہ کیوں؟ اس لئے کہ عطاء اللہ شاہ بخاری، ایک دفعہ نہیں، بہت دفعہ میانوالی تشریف لے گئے۔ لیکن یہ کفن والی بات تو کبھی نہیں سنی گئی۔ بالکل بھی نہیں۔ ہاں، شاہ صاحب کے ایک ساتھی تھے مولانا محمد گل شیر! احراری خطیبوں کی سنگت میں بہت نمایاں تھے۔ یہی وہ ”مردح“ تھا جس نے ۱۹۴۳ء میں نواب کالا باغ کے مظالم کے خلاف عوامی تحریک کا آغاز کیا اور ۱۹۴۴ء کے وسط میں، نواب صاحب کے حسب الارشاد، کفن اوڑھ کر، آسودہ خاک ہو گیا۔ اس اجمال کی کچھ تفصیل عرض کر دینا یوں بھی ضروری ہے کہ آج کی نسل تو نواب کالا باغ سے بھی کچھ زیادہ واقف نہیں چہ جائیکہ اسے مولانا گل شیر اور عطاء اللہ شاہ بخاری کے افکار و سونخ سے کچھ علاقہ ہو۔

یہ مولانا گل شیر صلح ایک کے ایک گاؤں (لمووالی) کے رہنے والے تھے۔ شمالی پنجاب میں ایک، کیسبل پور، میانوالی، سرگودھا، خوشاب، جہلم وغیرہ کے علاقوں میں یہی ایک آواز تھی جو جاگیرداروں، وڈیروں، نوڈوں، کاسر لیسوں اور فرنگیوں کے لئے، ۱۹۲۸ء سے سوہان روح بن گئی تھی۔ خوف، مولانا کی چڑھی میں نہیں تھا۔ مستزاد یہ کہ غضب کے خوش بیان، خوش الحان اور خوش شکل بھی! یہ واقعہ ہے کہ خلقت ان کی دیوانی تھی۔ پروفیسر مرزا محمد مہر کے الفاظ ہیں کہ

”میں مولانا گل شیر کو عطاء اللہ شاہ بخاری سے برتر مقرر جانتا ہوں۔ ان کے بیان میں جو سوز اور درد

انتہائی بغیر تھی! اپنے نواب صاحب، نواب ہی تو تھے، یا پھر مغربی پاکستان کے گورنر ہو گئے۔ جبکہ سکندر مرزا صاحب تو گورنر جنرل اور صدر مملکت بھی ہوئے۔ ان کی تب و تاب جابرانہ کا کیا سنا۔ چودھری محمد علی، حسین شہید سہروردی، آئی آئی چندریگر، ملک فیروز خان،۔۔۔۔۔ یہ سب وزرا نے اعظم انہوں نے یکے بعد دیگرے یوں بھگتائے اور چلتے کے کہ۔۔۔۔۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ ان کے مزاج کی رنگینی اور دماغ کی سنگینی کی داستانیں، الطاف گوہر صاحب کے علم میں بھی یقیناً ہوں گی۔ بہر حال میں یہاں شورش کاشمیری کی ایک روایت نقل کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں۔

”شیخ حسام الدین، حسین شہید سہروردی کے ساتھ عوامی لیگ میں شامل ہو گئے۔ ایک دن سہروردی صاحب نے ان سے کہا۔۔۔۔۔ شیخ صاحب! سکندر مرزا (صدر مملکت) کو مجلس احرار کے بارے میں غلط فہمی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کا ذہن صاف ہو جائے لیکن آپ کی اس سے ملاقات مفید ہوگی۔ غرض شیخ صاحب اور ماسٹر تاج الدین انصاری، سکندر مرزا سے ملاقات کیلئے گورنمنٹ ہاؤس لاہور، میں گئے۔ سکندر مرزا، اپنے صدارتی جاہ و جلال کے ساتھ برآمد ہوا اور شاہانہ بے نیازی کے ساتھ فروکش ہو گیا۔ ڈاکٹر خان صاحب، صوبہ کے وزیر اعلیٰ، ہر اتھے۔ سہروردی نے مرزا سے کہا ”دونوں احرار رہنا، شیخ صاحب اور ماسٹر جی، آئے ہیں۔“ مرزا نے حثارت سے جواب دیا ”احرار؟ پاکستان کے غدار ہیں۔“

ماسٹر جی، شہنزی طبیعت کے مالک، کہنے لگے۔ غدار میں تو پھانسی پر کھنچا دینے، لیکن الزام کا ثبوت ہونا چاہیے۔ سکندر مرزا نے اسی رعوت سے جواب دیا۔

”بس میں نے کہہ دیا ہے کہ احرار غدار ہیں۔“

ماسٹر جی نے محل کا رشتہ نہ چھوڑا لیکن مرزا نے سرکش گھوڑے کی طرح پٹھے پر ہاتھ ہی نہ دھرنے دیا۔۔۔۔۔ وہی ڈاڑھا خانی!

شیخ صاحب نے غصہ میں کروتی لٹی۔ مرزا سے پوچھا، کیا کہا آپ نے؟

میں نے؟

جی ہاں!

”احرار، پاکستان کے غدار ہیں۔“ مرزا نے مٹھی بھینچتے ہوئے کہا۔

شیخ صاحب کہاں کہتے۔ گورنمنٹ ہاؤس، گورنر موجود، وزیر اعلیٰ موجود، وزیر اعظم موجود، صدر مملکت کی بارگاہ! فوراً جواب دیا۔۔۔۔۔ ”احرار، غدار ہیں کہ نہیں۔ اس کا فیصلہ ابھی تاریخ کرے گی۔ تمہارا فیصلہ تاریخ کر چکی ہے کہ تم غدار ابن غدار ہو۔ تمہارے جد امجد میر جنجر نے سراج الدولہ سے غداری کی تھی۔ تم اسلام کے غدار ہو۔“ ڈاکٹر خان نے شیخ صاحب کو آغوش میں لے لیا اور سکندر مرزا سے پشتوں میں کہا۔ ”میں نے تمہیں پہلے کہا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ شریکانہ لہجہ میں بولنا۔ یہ بڑے بے ڈھب لوگ ہیں۔“ ظاہر ہے کہ ہلی، ایک ہی جھٹکے میں سپر انداز ہو جاتی ہے۔ یکا یک اس کا سب و لہجہ ہی بدل گیا۔

مجھے اس روایت پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا اور نہ کوئی حاشیہ چڑھانا ہے۔ عیاشی راہجہ بیاں ۹ لیکن ایک

اصل میں مجھے بھی حیرانی یہ ہوئی ہے کہ عطاء اللہ شاہ بخاری سے متعلق نواب کالا باغ کے بیان کو الطاف صاحب نے یوں پیش فرمایا ہے کہ (معذرت کے ساتھ) گویا اس کی Credibility کا اشتہار ہو گئے ہیں۔ حالانکہ ان سے بہتر کے انداز ہو گا کہ یہ، اصول روایت کے سراسر منافی ہے۔ پھر، عطاء اللہ شاہ بخاری اور اس کیٹڈے کے دوسرے لوگوں کے متعلق یہ باور کر لینا کہ وہ حریف اور مد مقابل سے یوں آسانی سے ہار مان گئے ہوں گے "انتہائے سادگی" ہی تو ہے۔ یہ لوگ تو جس مٹی کے بنے ہوئے تھے اس میں ظلم کے مقابلے میں Diplomacy کی بجائے Contumacy کا عنصر پوری طرح (بلکہ بری طرح) غالب و حاوی تھا۔

یہاں سوال یہ نہیں کہ ایسی روایتوں اور حکمتوں کا سامنے آنا کس سطح کے لوگوں کی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ اس اشتغال سے گریز و احتراز کس حد تک لازم ہے۔؟ خود الطاف گوہر صاحب کو آج بھی بہت سے نوابان سبز باغ، مجیب الرحمن کے چھے نکات کا مصنف بتلاتے ہیں۔ اسی طرح ذوالفقار علی بھٹو سے گوہر صاحب کو جو تعزیر و تہذیب پر مبنی تعلق رہا ہے، اس کے Second Phase کے متعلق راول عبدالرشید فرماتے ہیں کہ "بھٹو صاحب نے ان کو انٹینیشن کیا۔ ان کے بجائے (تجمل حسین) کو سفیر بنا کے بھیجا۔ انکو روٹی پلائٹ کا ٹھیکہ دیا۔ آخر الطاف گوہر نے بھٹو صاحب کے ساتھ سمجھوتہ اصولوں پہ کیا۔" کیا یہ سب کچھ مان لیا جائے؟ اور کیوں نہ مان لیا جائے؟۔۔۔۔۔ امید ہے گوہر صاحب میرا نکتہ سمجھ گئے ہوں گے۔

ہفت روزہ "لاہور" لاہور (مرزائی جریدہ)

ان کا بدل شاید ہی پیدا ہو سکے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات دراصل سابق علاقہ پنجاب کے عوامی نفسیات کے ماہر ایک ایسے شعلہ بیان مقرر کی وفات ہے جس کا بدل شاید ہی پیدا ہو سکے۔ پنجاب کے عوام کو تو جس طور پر ان کا تھیروں کا ایسا لپکا بلکہ چکا تھا کہ وہ نظریاتی مخالفت کے باوجود رات گئے تک بیٹھ کر آپ کی تقریریں سنتے اور چسکے لیتے رہتے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل جب احرار کا کانگریس سے سا جھا ہو چکا تھا اور یہ جماعت اس نئی اسلامی مملکت کے قیام کو ناممکن بنانے کے لئے ہر ممکن سعی میں مصروف تھی۔ احرار نے حسب معمول شاہ صاحب کے حسن خطاب کو آلہ کار بنایا اور اس دور کی سیاست میں عملی دلچسپی لینے والے گواہ ہیں کہ مسلم لیگ کے لگتے ہی شیدا والہ ان کی تقریریں اسی ذوق و شوق سے سننے آتے تھے جتنے ذوق و شوق سے وہ اپنے ووٹ مسلم لیگ کو دیتے تھے۔

نئی زندگی میں شاہ صاحب نہایت ہی سادہ اور پُر خلوص، بذلہ سنج اور ملنسار انسان تھے۔ جماعت احرار نے ہمیشہ آپ کی سادگی کو اپنی سیاسی اغراض کے لئے اکسپلاٹ کیا اور وہ اپنی ان کمزوریوں یا صفات کے باعث ہمیشہ اکسپلاٹ ہو جاتے رہے۔ شاہ صاحب کے گلے میں ایک عجب و غریب قسم کا رس تھا جس کا حسن و جذب عام طور پر اس وقت ظاہر ہوا کرتا تھا جب اپنی تقریروں سے پہلے تلاوت کلام پاک کیا کرتے تھے۔